محمد الیاس خان

روس - چین تحالف: نیا عالمی نظام، نئے معادلات قوّت

اپنے مادر وطن میں سوویت قابض افواج سے برسرِ پیکار افغان مجاہدین کی بے پناہ قربانیوں کی بدولت ۸۰ کی دہائی کے اختتام تک مغربی فوجی اتحاد (ناٹو) کا حریف اشتراکی فوجی اتحاد (وارسا) زمین بوس ہوچکا تھا۔ دیوار برلن ٹوٹ چکی تھی۔ اور مشرقی یورپ کے ممالک کمیونزم کے سحر سے یکے بعد دیگرے آزاد ہورہے تھے۔ دس سالہ جنگ افغانستان خود سابق سوویت یونین کی معیشت، سیاست اور ملکی انتظامی ڈھانچے کے لیے ایک ایسا دھچکہ ثابت ہوئی جس نے ان تمام ملمع سازیوں اور تصنع کو بے نقاب کرنے کا عمل انتہائی تیز تر کردیا جو سوویت یونین کی تشکیل میں کار فرما تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے سماجی، سیاسی اور انتظامی ڈھانچے منہدم ہونا شروع ہوگئے۔ ۱۹۹۱ء کے اواخر تک پوری دنیا میں اشتراکی انقلاب برپا کرنے کی دعویدار دنیا کی دوسری "سپر پاور" خود اپنے ریاستی ڈھانچے "یونین" کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھنے میں مکمل طور پر ناکام ہوگئی۔ اور یوں سابق سوویت یونین بکھر کر ۱۵ آزاد ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔

> نئے عالمی نظام کے اس امریکی منصوبے میں اگرچہ لمبے عرصے کے لیے یورپ کے ساتھ اشتراک کو بنیادی نکتہ تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم "متحدہ یورپ" یا [Uinted States of Europe] کے ظہور کے امکان کو پیش نظر رکھ کر ایسے اقدامات بھی اٹھائے جارہے ہیں جن کا مقصد خود ایسی مغربی طاقتوں کے گرد حصار قائم کرنا اور ان کے "آزادی عمل" کو محدود کرنا ہے جو "ریاست ہائے متحدہ یورپ" بمقابلہ "ریاستہائے متحدہ امریکہ" کے تصور کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔

سوویت یونین کے انہدام پر بین الاقوامی حلقوں کا ردعمل مختلف تھا۔ مغرب میں اسے مغربی سیاسی و اقتصادی نظاموں اور مغربی معاشرتی اقدار (علمانیت) کی فیصلہ کن فتح قرار دیا گیا، جب کہ عالم اسلام نے اسے کمیونزم کی توسیع پسندی کے مقابلے میں "جہاد" کے اسلامی جذبے کی فتح سے تعبیر کیا۔ بہر حال سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد کے سات سالوں کے دوران میں اختیار کی گئی مغرب و

امریکہ کی حکمت عملیوں سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئی کہ اگرچہ کمیونزم کو شکست دینے میں افغان مجاہدین کی لازوال قربانیوں اور عالم اسلام و "بین الاقوامی برادری" کی طرف سے ان کی زبردست مادی اور اخلاقی امداد نے اہم کردار ادا کیا تاہم اس جہاد کے لیے "بین الاقوامی برادری" کی حمایت و پشت پناہی اکیسویں صدی میں عالمی حکمرانی سے متعلق مغرب و امریکہ کے ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصّہ تھی۔ یہ سوچا سمجھا منصوبہ امریکہ کا "نیو ورلڈ آرڈر" ہے۔ امریکہ کے اس نیو ورلڈ آرڈر کا منصوبہ سوویت یونین کے انہدام اور کمیونزم کی پسپائی پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس منصوبے کا مقصد کرّہ ارض پر ہر ایسی طاقت کے علاقائی و عالمی اثر و رسوخ کو بالکلیہ ختم یا محدود کرنا ہے جو امریکہ کے "نیو ورلڈ آرڈر" کے تحت اس کی عالمی حکمرانی کے لیے چیلنج بن سکے۔

"نیو ورلڈ آرڈر" کے اس امریکی منصوبے میں امریکہ کے علاوہ دیگر طاقتوں کو "امریکہ دوستی" اور "امریکہ دشمنی" نیز امریکی بالادستی کو چیلنج کرنے کے امکانات کے حوالہ سے مختلف اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے جس کے مطابق ایک عبوری دور کے لیے ان میں سے بعض کو "پارٹنر" بنایا جائے گا، بعض دیگر کے لیے engagement کی پالیسی اختیار کی جائے گی، اور بعض کو اقتصادی سبوتاژ اور بین الاقوامی برادری میں یکہ و تنہا کرنے کی پالیسیوں کا نشانہ بنایا جائے گا۔ امریکہ کے اس "نیو ورلڈ آرڈر" کے منصوبہ کی تنفیذ کے لیے جو ہتھیار استعمال کیے جا رہے ہیں یا کیے جائیں گے ان کا انتخاب بھی متعلقہ علاقے، ملک یا خطّے کی مذکورہ بالا تقسیم میں مقام کو پیش نظر رکھ کر کیا جا رہا ہے اور کیا جائے گا۔ "کمیونسٹ قوم پرستی"، "روسی شاونزم"، "چینی تفرد پسندی"، "مسلم بنیاد پرستی"، جرمنی اور جاپان کی "روایتی تمرّد پسندی" اور اسلامی تہذیب کی حامل اقوام اور "زرد نسلوں" کی "متوقع بیداری" [reassertion] کے مختلف خطرات کا سر کچلنے کے لیے مناسب حال ہتھیاروں کا استعمال شروع ہو چکا ہے۔

نئے عالمی نظام کے اس امریکی منصوبے میں اگرچہ لمبے عرصے کے لیے یورپ کے ساتھ اشتراک کو بنیادی نکتہ تسلیم کیا گیا ہے۔ تاہم "متحدہ یورپ" یا [Uinted States of Europe] کے ظہور کے امکان کو پیش نظر رکھ کر ایسے اقدامات بھی اٹھائے جا رہے ہیں جن کا مقصد خود ایسی مغربی طاقتوں کے گرد حصار قائم کرنا اور ان کے "آزادی عمل" کو محدود کرنا ہے جو "ریاست ہائے متحدہ یورپ" بمقابلہ "ریاستہائے متحدہ امریکہ" کے تصور کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں جنگ بلقان میں جرمنی اور دیگر مغربی طاقتوں کے کردار کی نفی اور امریکی قیادت کے بغیر ناٹو کے دیگر مغربی شرکاء کی امن کوششوں کو ناکامی سے دوچار کرنے پر مبنی امریکی رویّے کی طرف اشارہ کافی ہوگا۔

امریکہ کے اس "نئے عالمی نظام" کے منصوبہ میں یورپ، ایشیا اور بحرالکاہل کی دو اہم طاقتوں روس

اور چین کو کیا مقام حاصل ہے اور انہیں اس نئے عالمی نظام کے لیے چیلنج بننے سے روکنے کے لیے امریکی [اور بالتّبع مغربی] حکمت عملی کیا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب تلاش کیے بغیر حالیہ "روس - چین تزویراتی تحالف" کو سمجھنا مشکل ہو گا۔ ۸۰ کی دہائی میں افغان جنگ کے دوران میں اگرچہ مغرب اور امریکہ نے سابق سوویت یونین کو اقتصادی طور پر دیوالیہ کرنا اوّلین مقصد کے طور پر پیش نظر رکھا۔ اور بظاہر اسی ہدف کے حصول کے لیے انہوں نے افغان مجاہدین کو [پاکستان کی وساطت سے] بعض ایسا اسلحہ بھی فراہم کیا کہ عام حالات میں آزادی کی تحریکوں کو تو کجا تیسری دنیا اور خاص کر مسلم ممالک کی حکومتوں کو بھی اس کی فراہمی کے بارے میں نہیں سوچا جا سکتا تھا۔ مگر گورباچوف دور کے آخری ایام میں سوویت اقتصادی صورت حال کی مکمل تباہی کا جو منظر سامنے آیا اس نے مغرب و امریکہ کو نئی پریشانیوں سے دوچار کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سوویت یونین کے انہدام کے مابعد کے دور میں روسی معیشت کی حد سے زیادہ تباہی امریکہ اور مغرب کے لیے اصل مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ صورت حال کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کے لیے یہ حقیقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ سابق سوویت یونین کی جانشین ریاست روسی فیڈریشن کے اقتصادی ڈھانچوں کی تباہی کے باوجود وہ سوویت یونین کی زبردست فوجی قوّت کی وارث ہے۔ اقتصادی تباہی اور فوجی قوّت کا یہ تضاد مغرب و امریکہ کے نقطۂ نظر سے تباہ کن نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

مغرب و امریکہ کے لیے اس تضاد کی ہلاکت خیزی کی متعدد جہتیں ہیں۔ اولاً روس اپنی اقتصادی مشکلات پر قابو پانے کے لیے واحد دستیاب تجارتی متاع یعنی ہلاکت خیز اسلحہ اور اس کی ٹیکنالوجی برآمد کرنے کی روش اختیار کر سکتا ہے۔ روس کے پڑوس میں ایسے ممالک کی موجودگی، جو امریکہ کی دشمن تصور کی جاتی ہیں اور جو امریکہ کے ساتھ جاری بیک وقت سرد و گرم جنگوں میں ہزیمت سے بچنے کی غرض سے نہ صرف جدید ترین اسلحہ اور اس کی ٹیکنالوجی کی دستیابی کے لیے کوشاں ہیں بلکہ علاقے میں نئے حلیف تلاش کرنے کے عمل میں بھی مصروف ہیں، ان مغربی و امریکی خدشات کو دوچند کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ پچھلے دو سالوں کے دوران میں ماسکو کی طرف سے ایران، چین اور بھارت کے ساتھ جدید ترین اسلحہ اور اس کی ٹیکنالوجی کی فراہمی کے سمجھوتوں نے واشنگٹن اور اس کے حلیف مغربی دارالحکومتوں میں پریشانی کی زبردست لہر پیدا کی ہے۔ امریکہ اور مغرب شروع سے ہی اس خطرے کا ادراک رکھتے تھے اور اس کا تدارک کرنے کے لیے انہوں نے [اپنے خیال میں] کھل کر روس کی اقتصادی امداد کی۔ مگر روس کی اقتصادی تباہی کے حجم کے پیش نظر یہ مغربی اقتصادی امداد روس کی اقتصادی بحالی میں موثر کردار ادا نہ کر سکی۔ کریملن کے حکمران اور روسی عوام آہستہ آہستہ مغرب و امریکہ سے مایوس ہوتے چلے گئے۔ روسی عوام کی مغرب سے مایوسی کا واضح اظہار روسی انتخابات میں مغرب نواز اصلاحات پسندوں کے مقابلے میں قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کے حق میں ان کے فیصلہ سے ہوتا ہے۔

ثانیاً، اس تضاد کا دوسرا خطرناک پہلو یہ ہے کہ اقتصادی تباہی سے ہمکنار روس نہ صرف یہ کہ اپنے ہلاکت خیز اسلحہ کے ذخائر کی مثبت نگہداشت سے قاصر ہے بلکہ تخفیف اسلحہ کے بعض بین الاقوامی [CWC] اور بعض دیگر دو طرفہ معاہدات [سٹارٹ - ۱ اور سٹارٹ - ۲] کی تنفیذ بھی اس کے بس سے باہر ہے۔ امریکہ کی طرف سے توثیق کے عمل کی تکمیل کے باوجود روس ابھی تک سٹارٹ - ۲ معاہدے کی توثیق نہیں کر سکا ہے۔ حال ہی میں کریملن کے حکمرانوں نے کیمیائی ہتھیاروں پر پابندی کے میثاق [Chemical Weapons Convention] کی توثیق کرنے سے یہ کہہ کر معذرت ظاہر کی ہے کہ اس توثیق کے نتیجے میں کیمیائی ہتھیاروں کے روسی ذخائر کی تباہی اس کے لیے ممکن نہیں ہوگی۔ روسی ذرائع کے مطابق کیمیائی ہتھیاروں کے روسی ذخائر کی تباہی کے عمل کے لیے ۴،۳۵ بلین امریکی ڈالر درکار ہوں گے۔ چنانچہ ابتداءً روس کی اقتصادی تباہی پر خوشی و اطمینان کا اظہار کرنے والے مغربی حکمران اور امریکہ اب روس کی اقتصادی تباہی کو اپنے تزویراتی مفادات کے حوالہ سے نقصان دہ [counter productive] تصور کرنے لگے ہیں۔

اس پس منظر میں یوں لگتا ہے کہ اب امریکہ اور دیگر مغربی طاقتوں کی حکمت عملی یہ ہے کہ ایک طرف تو روس کے سیاسی اثر و رسوخ [political influence] کو محدود [contain] کرنے کے طویل المیعاد منصوبے پر کام کیا جائے اور دوسری طرف اس کی اقتصادی امداد کا بہاؤ اس طرح سے "ایڈجسٹ" کیا جائے کہ نہ تو اس کا مقصد ماسکو کی اقتصادی مشکلات کا خاتمہ ہو اور نہ ہی یہ روسی عوام اور قیادت کی مغرب سے مکمل مایوسی کا ذریعہ بنے۔ اس حکمت عملی کا واضح اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ امریکہ اور مغرب سابق سوویت بلاک کے ممالک [اور شاید مستقبل میں کسی مرحلہ پر خود سابق سوویت ریاستوں] کو تو ناٹو میں رکنیت دینے کے لیے بے تاب ہیں لیکن خود روس کو نہ تو [اس کی موجودہ فوجی قوت کے ساتھ] ناٹو میں رکنیت دینے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ قانونی طور پر واجب الالتزام کسی ایسے معاہدہ کی تشکیل کے لیے تیار ہیں جس کی بنا پر یورپ کے معاملات میں اس کے کردار کو تسلیم کیا جائے۔ ناٹو کے ساتھ ماسکو کے تعلقات کے حوالے سے ایک سیاسی چارٹر کے لیے بات چیت ہو رہی ہے مگر اس چارٹر کے حوالے سے ناٹو میں شامل امریکہ اور مغربی ممالک کا موقف یہ ہے کہ یہ چارٹر ایک سیاسی دستاویز ہوگی جس کی توثیق ناٹو ممبران کے قومی پارلیمانوں سے ضروری نہیں ہوگی۔ روس کے اس مطالبے کو رد کر دیا گیا ہے کہ ناٹو کے ساتھ کوئی معاہدہ یا چارٹر قانونی طور پر واجب الالتزام ہونا چاہیے۔ مغرب و امریکہ جن کے لیے اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں روس کے حق استرداد (ویٹو) سے نباہ کرنا مشکل ہو رہا ہے روس کو خود ناٹو کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے [ویٹو کرنے] کے مواقع کیوں فراہم کریں گے؟

سرد جنگ کے نام نہاد اختتام کے بعد بھی ناٹو میں شامل امریکہ اور مغربی ممالک اس خوف کا

بدستور شکار نظر آرہے ہیں کہ مستقبل میں کسی بھی وقت روس میں ایسی قیادت منظر عام پر آسکتی ہے جو مغرب و امریکہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی خواہشمند ہوگی۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ مغرب و امریکہ سرد جنگ کے متوقع نئے مرحلہ سے نبرد آزمائی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اگرچہ بظاہر اُنھوں نے کمیونزم کی پسپائی اور کمیونسٹ بلاک کی تحلیل کے بعد ناٹو کی موجودگی اور اس کی توسیع کے جواز کے لیے نیا نظریہ (doctrine) پیش کیا ہے جس کے مطابق بدلتے ہوئے عالمی حالات میں یورپ میں سیاسی استحکام اور امن سازی ناٹو کا مشن ہوگا لیکن عملاً جو اقدامات اٹھائے جارہے ہیں وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ناٹو کا واحد مقصد مغرب و امریکہ کے علاوہ کسی بھی طاقت کی عالمی اُمور میں فیصلہ کن [یا کم از کم مؤثر] کردار ادا کرسکنے کی اہلیت کو مکمل طور پر ختم کرنا ہے۔

> امریکہ اور دیگر مغربی طاقتوں کی حکمت عملی یہ ہے کہ ایک طرف تو روس کے سیاسی اثر و رسوخ [political influence] کو محدود [contain] کرنے کے طویل المیعاد منصوبے پر کام کیا جائے اور دوسری طرف اس کی اقتصادی امداد کا بہاؤ اس طرح سے "ایڈجسٹ" کیا جائے کہ نہ تو اس کا مقصد ماسکو کی اقتصادی مشکلات کا خاتمہ ہو اور نہ ہی یہ روسی عوام اور قیادت کی مغرب سے مکمل مایوسی کا ذریعہ بنے۔

یہ درست ہے کہ ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے مغرب و امریکہ کے لیے روس کی اہمیت مسلّمہ ہے لیکن مغرب و امریکہ روس کو صرف علاقائی طاقت کی حیثیّت سے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مغرب روس کو وسطی ایشیا اور قفقاز میں فیصلہ کن کردار دینے کے لیے تیار ہے۔ اور اس کی بھی وجہ یہ ہے کہ ["اسلامی بنیاد پرستی" اور "مسلم عسکریت پسندی" کی آماج گاہ کہلانے والے] ان مسلم علاقوں میں خود مغرب اور روس کے مفادات میں یکسانیت [convergence] پائی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ علاقائی طاقت کی حیثیّت سے مغرب کو روس کی بطور حلیف ضرورت ہے۔ تاکہ مشرق وسطیٰ، افریقہ، جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا اور بحر الکاہل کے علاقوں میں ناٹو اور خاص کر امریکہ کے ممکنہ عسکری و سفارتی اقدامات کو اقوام متحدہ کے سیکورٹی کونسل میں روس کے حق استرداد سے بچایا جاسکے۔

ثالثاً، مغرب و امریکہ کو یہ زبردست خطرہ لاحق رہا ہے کہ اقتصادی طور پر تباہ حال روسی افواج، روسی دفاعی ماہرین، حکمت کار اور جوہری سائنسدان روح اور جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے پڑوس کی "دشمن" مگر وسائل سے مالامال [مسلم] اقوام کی ترغیب کا شکار بن سکتے ہیں اور یوں امریکہ کے دشمنوں کی تقویت کا باعث بن سکتے ہیں۔ اس محاذ پر بھی امریکی پچھلے چھ سات سال سے سرگرم رہے ہیں اور اس عمل کو روکنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرتے رہے ہیں۔ بہرحال روس اور سابق سوویت ریاستوں سے انفرادی اور ریاستی سطح پر ٹیکنالوجی اور فنی مہارت کی پڑوسی ریاستوں تک منتقلی کے عمل کو مغرب و

امریکہ [مکمل طور پر] روکنے میں ناکام رہے ہیں۔ جوہری شعبے میں ایران کے ساتھ روس کا تعاون مغرب و امریکہ میں زبردست خوف و ہراس کا سبب بنا ہوا ہے۔ دوسری طرف ماسکو مغرب و امریکہ کے طویل المیعاد روس مخالف منصوبوں کا ادراک کرتے ہوئے ایک نئے معادلہ قوّت کی تشکیل کی راہ پر گامزن ہے۔ ماسکو سمجھتا ہے کہ اس سلسلے میں ایران، بھارت اور چین کے ساتھ تحالف عالمی سطح پر اقتدار کی سیاست [global power politics] میں اس کا پلڑہ بھاری کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

ایشیا بحرالکاہل کے علاقے کی ایک اور بڑی طاقت چین ہے۔ چین کے ساتھ مغرب و امریکہ کے تعلقات کی نوعیّت مختلف ہے۔ اور نتیجتاً چین سے مغرب و امریکہ کا احساس خوف [threat perception] بھی مختلف ہے۔ روس کے برعکس چین کی روز افزوں اقتصادی ترقی اور اس کا بڑھتا ہوا سیاسی اثر و رسوخ مغرب کی پریشانی کا باعث ہیں۔ چین دنیا کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ اس کی اقتصادی ترقی کی رفتار انتہائی تیز ہے۔ پچھلے پانچ سالوں میں اس کی قومی پیداوار میں اضافہ کی شرح تقریباً ۱۲ فیصد رہی ہے۔ اس کی برآمدات میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، اس کی فوجی طاقت مسلّمہ ہے، جدید ترین ٹیکنالوجی تک اس کی رسائی کی رفتار انتہائی تیز ہے اور ان تمام حقائق کے پیش نظر بین الاقوامی معاملات میں "آزادانہ کردار" ادا کرنے کی اس کی صلاحیت لامحدود ہے۔ چین اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کا مستقل رکن ہے اور حق استرداد کا حامل ہے۔ چین عالمی اُمور میں اپنے نسبتاً آزادانہ مواقف کی بنا پر تیسری دُنیا کے ممالک کی زعامت اور لیڈر شپ کی زبردست صلاحیتیں رکھتا ہے۔ یہ تمام صلاحیتیں ایسی ہیں جن کی بدولت مغرب و امریکہ چین کے ساتھ تعلقات میں "مسالمانہ "رویّہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ چین کے خلاف تعزیری اقدامات اٹھانے کی پالیسیاں ناکامی سے دوچار ہو چکی ہیں۔ چین کو مغرب و امریکہ ۲۱ ویں صدی میں اپنی بالادستی کے لیے ایک حقیقی خطرہ اس لیے بھی سمجھتے ہیں کہ روس کے برعکس وہ تاہنوز مغرب کے اقتصادی و سیاسی نظاموں اور مغربی سماجی معیارات و اقدار کو تسلیم [subscribe] نہیں کرتا ہے۔ چنانچہ امریکی عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل میں امریکہ کا سب سے بڑا تزویراتی حریف [main strategic rival] چین ہوگا[1]۔ اپنی مرضی کے سیاسی و اقتصادی نظاموں پر کاربند رہنے کی بنا پر امریکی دانشور و پالیسی ساز چین کو امریکہ کا نظریاتی حریف سمجھتے ہیں[2]۔ واشنگٹن کے سیاسی حلقوں میں پچھلے کچھ عرصہ سے اس بات پر بحث چل رہی ہے کہ امریکہ کو بیجنگ کو کھلا دشمن سمجھتے ہوئے اس کے معاملے میں گھیراؤ [containment] کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ یا اسے "بین الاقوامی نظام کا مؤثر حصّہ" بنانے کے لیے اس کے معاملے میں [بات چیت اور معاملہ سازی میں] مصروف رکھنے [engagement] کی پالیسی پر عمل درآمد ہونا چاہیے[3]۔ کلنٹن حکومت کی موجودہ چائنا پالیسی سے اکثر امریکی حلقے خوش نہیں ہیں اور وہ اسے "دشمن کی خوشنودی"

[appeasement of enemy] قرار دیتے ہیں۔ تائیوان کے معاملے میں بہرحال امریکی پالیسی چین کے خلاف جارحانہ انداز کی حامل ہے۔ امریکہ چین کے مقابلے میں تائیوان کو عسکری لحاظ سے مضبوط کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ اس نے ۱۹۹۴ء میں تائیوان کے ساتھ ایک سو پچاس ایف ۱۶ طیاروں کی فراہمی کا معاہدہ کیا۔ نیز اس نے فرانس کی طرف سے تائیوان کو ساٹھ میراج ۲۰۰۰ لڑاکا طیاروں کی فراہمی کے سمجھوتے کی تکمیل میں بھی کردار ادا کیا۔ چین تائیوان کو اپنا صوبہ سمجھتا ہے اور وہ اسے ہر طریقہ سے چین میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ پچھلے سال چینی افواج کی طرف سے فوجی مشقوں کے دوران میں امریکہ نے آبنائے تائیوان [Taiwan Strait] میں دو طیارہ بردار جہاز بھیج دیے تھے۔ بیجنگ کے لیے امریکیوں کا یہ عمل چین کے ساتھ کھلی دشمنی کے مترادف تھا۔

ہانگ کانگ کے معاملے پر بھی امریکی چین کے ساتھ کھلی دشمنی پر اتر آئے ہیں۔ امریکی ہانگ کانگ میں "جمہوریت کے تحفظ" کی خاطر مداخلت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ جولائی میں ہانگ کانگ چینیوں کے حوالہ کیے جانے کے بعد وہاں چینیوں کو اپنی مرضی کا نظام متعارف کرانے سے روکنے کے لیے ہر ممکن کاروائی کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے ہانگ کانگ کے چین مخالف سیاسی لیڈروں کو امریکہ میں پناہ دینے کا عمل شروع کر دیا ہے[۴]۔

واشنگٹن نے چین کی تیز رفتار اقتصادی ترقی اور ۲۱ ویں صدی میں "امریکی مفادات" کے لیے خطرہ بننے کی اس کی صلاحیت کو محدود کرنے کے لیے بیجنگ - ٹوکیو اختلافات کو ہوا دینے کا عمل بھی شروع کیا ہوا ہے۔ جاپانیوں کو چینیوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ڈرایا جا رہا ہے اور انہیں اس بات پر قائل کیا جا رہا ہے کہ چینی خطرے سے نمٹنے کے لیے جاپان کی سرزمین پر امریکی افواج کی موجودگی اور امریکہ جاپان تزویراتی اتحاد کو مزید مضبوط کرنا انتہائی ضروری ہے[۵]۔ تبت کے معاملے پر بھی واشنگٹن بیجنگ کو زچ کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ تبت کے دلائی لاما کو واشنگٹن اور دیگر مغربی دارالحکومتوں کی زبردست پشت پناہی حاصل رہی ہے۔

بیجنگ کو اپنی ان "کمزوریوں" کا احساس ہے۔ اس نے بھارت کے ساتھ اپنے سرحدی تنازعات کو حل کرنے میں پیش رفت کی ہے۔ بیجنگ تائیوان کی حکومت کو تسلیم نہ کرنے کے باوجود اس کے ساتھ تجارتی روابط کو توسیع دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے[۶]۔ بیجنگ جاپان کے ساتھ بھی اقتصادی تعاون بڑھانے کی راہیں تلاش کر رہا ہے۔ لیکن بیجنگ کو امریکہ کی جارحانہ پالیسیوں کو ناکام بنانے کے لیے جس علاقائی شریک کار کی ضرورت ہے وہ روس ہے، جو خود بھی مستقبل کے لیے امریکی عزائم سے خوفزدہ ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات معمول پر لانا اور پھر دونوں ممالک کے مابین ایک تزویراتی - دفاعی اتحاد کی تشکیل ان دونوں علاقائی طاقتوں کی ضرورت رہی ہے۔ دونوں طاقتوں کے درمیان قربت کا آغاز گورباچوف عہد میں گلاسناسٹ اور پیروسٹرائکا پالیسیوں کے نفاذ کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔

۱۹۸۹ء میں سوویت صدر گورباچوف نے پیکنگ [اب بیجنگ] کا دورہ کر کے اس قربت کو رسمی شکل دی۔ قربت کے اس عمل کو مزید مضبوط کرنے کے لیے چینی صدر جیانگ زیمن نے ۱۹۹۴ء میں ماسکو کا پانچ روزہ دورہ کیا۔ صدر زیمن کے اس دورۂ ماسکو کے نتیجے میں دونوں علاقائی جوہری طاقتوں کے مابین ایک دوسرے کے خلاف جوہری اسلحہ کے استعمال میں پہل نہ کرنے کا سمجھوتہ طے پا گیا۔ ۱۹۹۵ء میں چین کے وزیراعظم لی پنگ نے روس کے علاوہ بیلاروس اور یوکرین کے دورے کیے۔ اپریل ۱۹۹۶ء میں چین، روس، قازقستان، کرغیزستان اور تاجکستان کے درمیان شنگھائی میں ایک سرحدی سمجھوتے پر دستخط ہوئے۔ تاہم اس سمجھوتے کی حیثیت بحالیٔ اعتماد کے اقدام [confidence building measure] کی تھی۔ ماسکو بیجنگ اور وسط ایشیائی ریاستوں کی دارالحکومتوں میں اس بات کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے کہ بحالی اعتماد کے اس مرحلے سے آگے بڑھ کر چین - روس - وسط ایشیا مفاہمت کو تزویراتی اشتراک میں بدلنا وقت کا تقاضا ہے[۷]۔ ۲۳ اپریل کو چینی صدر کے دورہ ماسکو سے ایک ہفتہ قبل ۱۴ اپریل کو روسی وزیر دفاع چھ روزہ دورے پر بیجنگ وارد ہوئے۔ روسی وزیر دفاع ایگور روڈینوف کے دورۂ بیجنگ کے موقع پر چینی وزیر دفاع نے کہا:

> "We want to move towards the 21st century with Russia, so the two countries become for ever good neighbours, good partners, good friends and push forward their strategic partnership."

اس سے قبل مارچ میں چینی وزیر خارجہ نے صدر زیمن کے دورۂ ماسکو کی تفصیلات طے کرنے کے لیے روس کا دورہ کیا۔ بالآخر جب ۲۳ اپریل کو صدر زیمن ماسکو کے دورہ پر پہنچے تو انھوں نے اپنے اوّلین بیان [arrival statement] میں کہا کہ روس اور چین کے درمیان تعلقات کا یہ نیا دور "ایک نئے عالمی نظام کی تشکیل میں مثبت کردار ادا کرے گا"[۸]۔ صدر زیمن کے دورۂ ماسکو کے دوسرے روز صدر یلسن اور صدر زیمن نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا۔ اس مشترکہ بیان میں کھلے الفاظ میں واحد سُپر پاور کے تصوّر اور یک قطبی عالمی نظام سے عدم اتفاق کا اظہار کیا گیا۔ مغرب اور امریکہ کی طرف سے ناٹو میں مشرقی یورپ کے ممالک کو رکنیت دینے کے پروگرام کی بھی کھل کر مذمت کی گئی۔ بیان میں کہا گیا:

> "دونوں ملک ایک نئے اور عالمی طور پر قابل تطبیق سلامتی کے تصوّر [concept] کی تشکیل چاہتے ہیں۔ دونوں ممالک سرد جنگ کے دوران کی ذہنیت کے خاتمہ اور [فوجی] اتحادوں کی سیاست کی مخالفت پر متفق ہیں"[۹]۔

بین الاقوامی سیاست میں امریکی کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مشترکہ بیان میں کہا گیا:

> "کسی بھی ملک کو تسلط کی پالیسی اختیار کرنے، طاقت کی سیاست پر عمل کرنے یا بین الاقوامی معاملات میں اجارہ داری قائم کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے..... ایک عادلانہ

اور منصفانہ عالمی نظام کی ایجاد وقت کی اہم ترین ضرورت بن گئی ہے"[۱۰]۔

ناٹو میں توسیع سے متعلق مغربی اور امریکی اصرار پر اظہار تشویش کرتے ہوئے مشترکہ بیان میں کہا گیا:

"دونوں ممالک فوجی اتحادوں کو مزید مضبوط کرنے اور ان میں توسیع کی کوششوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح کے اقدامات بعض ملکوں کی سلامتی کو خطرات سے دوچار کر سکتے ہیں اور علاقائی و بین الاقوامی سطح پر کشیدگی میں اضافہ کا سبب بن سکتے ہیں"[۱۱]۔

چینی صدر کے دورۂ ماسکو کے دوران میں روس، چین، قازقستان، کرغیزستان اور تاجکستان کے مابین "تزویراتی اشتراک کے سمجھوتہ" [strategic partnership treaty] پر دستخط ہوئے۔ اس سمجھوتے کی رو سے ان ممالک کی مشترکہ سرحدات پر متعین افواج کی تعداد میں کمی کی جائے گی۔ اگرچہ اس سمجھوتے کی اہمیت علامتی [symbolic] ہے تاہم دونوں طاقتوں کے مابین تجارت اور دفاعی شعبوں میں بھی سمجھوتے طے پائے ہیں جن کے خوش کن اثرات دونوں ممالک اور پورے خطّے کی اقتصادیات اور سلامتی کے ماحول پر مرتّب ہوں گے۔ بعض حلقوں میں دونوں علاقائی طاقتوں کے لیڈروں کے مشترکہ بیان کے بعض حصّے امریکہ کے "نئے عالمی نظام" کو چیلنج کرنے کے مترادف سمجھے جا رہے ہیں۔ سیاسی مبصرین چین - روس مفاہمت کو بہت زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ تاہم دونوں لیڈروں کے مشترکہ بیان اور ان کے درمیان طے پانے والے سمجھوتے پر مغربی دارالحکومتوں کے ردعمل میں دونوں طاقتوں کے اشتراک کو مغربی مفادات کے منافی تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا۔ یوں لگتا ہے کہ مغرب و امریکہ دونوں ممالک کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنے کسی بھی اقدام سے عالمی اُمور میں مغرب و امریکہ کی بالادستی کو نقصان پہنچا سکیں۔ بہرحال اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ دونوں طاقتوں کا یہ اشتراک عالمی اُمور اور بین الاقوامی تعلقات میں دوررس اثرات کا حامل ہوگا۔

دونوں علاقائی طاقتیں اپنے اس اشتراک میں بھارت اور ایران کو بھی شامل کرنا چاہتی ہیں۔ ایرانی صدر نے تو کہہ دیا ہے کہ "روس، چین اور ایران تینوں علاقے کی اہم طاقتیں ہیں جو باہمی تعاون سے علاقے کی تقدیر بدل سکتی ہیں"۔ ایران اور روس کے مابین پہلے ہی سے کئی شعبوں میں تعاون کا عمل جاری ہے۔ تہران - دہلی تعلقات میں بھی خاصی بہتری پیدا ہوئی ہے۔ چین اور روس کی کوشش ہوگی کہ وہ اپنے اس تزویراتی اشتراک میں رسمی طور پر ایران و بھارت کو بھی شامل کرلیں۔

پاکستان نے بھی روس چین اشتراک کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے تاہم اس سلسلے میں وہ ایک مشکل صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اگرچہ چین کے ساتھ پاکستان کی دوستی بہت پرانی اور مضبوط ہے تاہم چین اور روس بین الاقوامی معاملات میں امریکہ کی بالادستی کے مخالف ہونے کے باوجود اس مغربی اور

امریکی اندازِ فکر کے اسیر ہیں کہ "مسلم بنیاد پرستی" اور "اسلامی عسکریت پسندی" ان کی قومی سلامتی [اور بین الاقوامی امن] کے لیے زبردست خطرہ ہے۔ بد قسمتی سے دونوں ممالک واقعتاً اپنے اپنے ملک [یا ملک کے سابقہ حصوں] میں — ان کے نقطۂ نظر سے — نام نہاد مذہبی بنیاد پرستی کی تحریکوں کا سامنا بھی کر رہے ہیں۔ چین کے صوبہ سنکیانگ [اب سنجیانگ] میں ترک نسلوں کے مسلمان استقلال [یا وسیع تر خود مختاری] کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ دوسری طرف سابق سوویت ریاستوں ازبکستان اور تاجکستان میں حزب اختلاف کے مذہبی حلقوں کی پارلیمانی جدّوجہد کو بھی "مذہبی بنیاد پرستی" کا نام دیا جارہا ہے۔ جن کی پشت پناہی کے لیے افغانستان کے "طالبان" کو موردِ الزام ٹھہرایا جارہا ہے۔

اس تناظر میں افغانستان میں "بنیاد پرستوں" کی ملیشیا "طالبان" کی مبینہ پشت پناہی اور کشمیری حریت پسندوں [جنہیں "مذہبی دہشت گرد" کے طور پر پیش کیا جارہا ہے] کی اخلاقی و سفارتی حمایت اسلام آباد اور بیجنگ کے درمیان بُعد پیدا کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ دوسری طرف یہی عوامل اسلام آباد اور ماسکو کے مابین قربت اور مفاہمت پیدا کرنے میں رکاوٹ ثابت ہوسکتے ہیں۔ نئی دہلی کی حکومت اس سلسلے میں پاکستان کے نقطۂ نظر سے تباہ کن کردار ادا کرسکتی ہے۔ اسلام آباد کو علاقے میں ابھرتے ہوئے طاقت کے اس نئے محور سے مستفید ہونے کے لیے مؤثر ڈپلومیسی سے کام لینا ہو گا۔ لیکن سب سے پہلے مسلّمہ قومی مفادات کو پیش نظر رکھ کر ایک واضح اور بامقصد پالیسی کی تشکیل ضروری ہوگی۔ امریکہ کی "تابعداری" کے ساتھ ساتھ بیجنگ، ماسکو اور تہران کے ساتھ خوش گوار تعلقات کے قیام کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔

حواشی

1. Nigel Holloway, "Making an Enemy," *Far Eastern Economic Review,* March 20, 1997,: "... almost all foreign policy analysts agree that in the future America's main strategic rival will be China."
2. Marc Blecher [of Oberlin College in Ohio], quoted by Nigel Holloway, Ibid,:"China challenges the ideological underpinning of Western policy that economic development will lead to political liberalisation. China shows us that market Stalinism works very well."
3. Nigel Holloway, op.cit.
4. Dorinda Elliot, "A Message for Beijing," *Newsweek*, April 28, 1997.
5. Kazuo Ogura, "The Shadow of China," *Time*, April 28, 1997. See also Nigel Holloway, op.cit.
6. Nisid Hajari, "High Seas Diplomacy," *Time*, April 21, 1997.
7. Reuter report, "Jiang to Visit Russia, Sign Border Pact," *The News*, April 11, 1997,: "The visit will be ... an equal trusted partnership aimed at strategic cooperation in 21st century."
8. AFP report, "Jiang in Moscow...," *The News*, April 23, 1997.
9. AFP report, "China Russia Oppose Unipolar World," *The News*, April 24, 1997.
10. Ibid.
11. Ibid.